# بجز داغِ ندامت

## حضرت مدنیؒ پر الزامات کی حقیقت، پس منظر اور مقاصد


تحریر

امجد علی شاکر



ناشر

مکتبہ کتاب گھر

اُردو بازار لاہور

042-7214882
0321-4044602


Scanned with CamScanner

## عرضِ ناشر

جناب امجد علی شاکر سے درخواست کی گئی کہ وہ قومیت، تحریک آزادی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے قلم اٹھائیں، بارہا اس موضوع پر گرد اٹھائی گئی اور حقائق کو دھندلا دیا گیا۔ اس دھندلاہٹ میں اکثر لوگ عجیب وغریب دعوے کرتے ہیں اور ایسے ثبوت لاتے ہیں جنھیں تہمت کے سوا کچھ کہنا ممکن نہیں۔

جناب امجد علی شاکر ایک شگفتہ نگار ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ محقق اور مئورخ بھی ہیں انھوں نے تاریخ کے حقائق کو کھولا ہے اور فکری مغالطوں کو دور کیا ہے۔ انہوں نے جس شرح وبسط سے اس موضوع کی الجھنوں کو سلجھایا ہے، وہ بجا طور پر قابل داد ہے۔ مضمون طویل تو ہے مگر اس کا جواز موجود ہے، یہ مضمون قابلِ مطالعہ بھی ہے اور لائقِ حوالہ بھی ہم اپنی خوش نصیبی پر رب ذوالجلال کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس مضمون کی جزئیات سے یقیناً اختلاف کیا جاسکتا ہے ہم اختلاف کرنے والوں کو خوش آمدید کہیں گے۔ ہاں اگر کسی لفظ یا جملے سے کسی دوست یا بزرگ کی دلآزاری ہوئی ہو تو مضمون نگار اور ناشر دونوں معذرت خواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ ہم پر حضرت مدنیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی محبتوں کا ہمیشہ قرض رہا ہے اللہ تعالیٰ اس مضمون کو ادائے قرض کا ذریعہ بنائے اور اکابر علماء حقہ کے ساتھ آخرت کی رفاقت نصیب فرمائے (آمین)

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

والسلام

عبد الوحید اشرفی

Scanned with CamScanner

# بجز داغِ ندامت

## حضرت مدنی رحمہ اللہ پر الزامات کی حقیقت، پس منظر اور مقاصد

پروفیسر امجد علی شاکر

اِن دنوں اہل سیاست چپ ہیں۔ وہ صرف دہشت گردی کے واقعات پر ہلکا سا احتجاج کرتے اور چپ ہو رہتے ہیں۔ وہ بولیں تو اہل صحافت بھی کچھ کہیں۔ اہل سیاست تو چپ رہ سکتے ہیں مگر اہل صحافت کی مجبوری ہے کہ وہ کالم لکھ کر روزی کماتے ہیں۔ وہ کیسے چپ رہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے:

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ان دنوں اہل صحافت کا دلچسپ مشغلہ مولانا فضل الرحمٰن کے بارے میں نقد، تبصرہ یا تحقیق و انکشاف رہ گیا ہے۔ کبھی انصار عباسی کوئی دلچسپ انکشاف کرتے ہیں، کبھی کوئی دوسرے محترم صحافی غزل سرا ہوتے ہیں۔ اِن دنوں حامد میر کا بھی دل پسند موضوع مولانا فضل الرحمٰن ہیں۔ ہمیں ان کے پسندیدہ موضوع پر تو کچھ کہنا نہیں، مولانا خود جواب دے سکتے ہیں۔ ان کے رفقاء بھی موجود ہیں۔

ہمارے بعض دوست بتاتے ہیں کہ ریڈیو ٹاک میں جب بات پھنس جائے تو اُسے یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ اس میں اقبال ڈالو۔ ایسا کریں تو بات چل نکلتی ہے۔ ویسے بھی اگر دیوار سامنے ہو تو ادھر اُدھر تو جانا ہی پڑتا ہے۔ آپ بال پھینکیں، سامنے دیوار آجائے تو وہ بے جان بال بھی اِدھر اُدھر کا رخ کرتا ہے۔ لکھنے والے تو بیچارے زندہ انسان ہیں۔ انہیں بات بنانا ہے۔ اگر بات بنانا ممکن نہ رہے تو علماء کے متعلق گفتنی و ناگفتنی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ آخر ہمارے شاعر بھی تو جب بات بنتی نظر نہ آتی تھی تو زاہد و واعظ کے خلاف بولنے لگتے تھے۔ ہمارے شاعر مشرق مفکر قوم بھی تو مُلا کے خلاف بہت کچھ کہتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے، اسے آج کا قاری تقدیر کے لکھے سے کم نہیں سمجھتا۔ اقبال نے کہا تھا:

مُلا کو جو ہند میں ہے سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

Scanned with CamScanner

ہمارے دوست مرزا جمود کا کہنا ہے کہ مُلّا صرف سجدے کی اجازت پر خوش ہو گیا وہ بھی لوگ تھے جو انگریز بہادر سے سر اور شمس العلماء یا خان بہادر کا خطاب پاتے تھے اور اسلام کی بے بسی پر خون کے آنسو روتے تھے۔ مُلّا جیل کاٹ کر ہندو کا گماشتہ کہلاتا تھا۔ سر اور خان بہادر انگریز کی نظر میں پسندیدہ ٹھہرے تھے اور آزادی کے جہاد میں بھی سرخیل نظر آتے تھے۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی سر آغا خاں کے پیروکار تھے۔ انگریز کے وفادار تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں چاول کے گوداموں کو آگ لگا کر قحط بنگال کے اسباب بھی پیدا کر چکے تھے۔ آزادی کے سرفروشوں میں بھی قیادت و سیادت کے مستحق تھے۔ انھیں ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ انگریز کے وفادار رہ چکے تھے۔ آزادی کے بعد امریکا میں پاکستان کے سفیر ہوئے تھے۔ ان سے زیادہ اس منصب کا اہل کون ہوتا۔ وہ امپریلزیم کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے یو۔ این۔ او میں رہ کر سر ظفر اللہ خاں کے ساتھ مل کر کشمیر کا مقدمہ لڑا۔ مقدمہ ہارا یا جیتا، یہ باتیں چھوڑیں۔ ان کی محنت کی داد تو وہ خود دیتے تھے۔ ہم کون ہوئے جو انھیں ناکام وکالت پر مطعون کر سکیں۔

ہم لوگ تو ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء اور کارگل جنگوں کے ہیروز کو دل کی گہرائیوں سے داد دیتے تھک گئے ہیں۔ کبھی جھوٹے منہ یہ نہ پوچھا کہ ان جنگوں میں شکست کا ذمہ دار کون تھا۔ برا بھلا کہنا ہو تو مولوی مُلّا کیا کم ہیں۔ پچھلی صدی میں کس کس شخص نے راہنما کے روپ میں رہزنی کی، فہرست طویل ہو تو کیا ہمیں مولوی کو برا بھلا کہنے سے فرصت کہاں؟

دنیا نے پچھلی صدی میں دو عظیم جنگیں لڑیں۔ لاکھوں لوگ اس کی زد میں آئے۔ برطانیہ نے برصغیر کے غلاموں کو عظیم جنگوں کا ایندھن بنایا۔ گاؤں اجڑ گئے۔ دیہات کے شیر جوان جانوروں کی طرح ہانکے گئے اور جنگ کے لیے دور دیس بھیج دیئے گئے۔ ہمارے ہاں بعض بزرگان تھے جو فوجی بھرتی کے لیے نوجوان مہیا کرتے تھے اور حکومت برطانیہ سے صلۂ وفا پاتے تھے۔ ان لوگوں کا عمل بے غرض وفا پر مبنی تھا اس لیے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے:

جن کا عمل ہے بے غرض ان کی جزا کچھ اور ہے

ہاں حکومت برطانیہ نے انھیں وفا کے صلے میں مربع الاٹ کر دیئے یا سونے کے کچھ خزف ریزے پیش کر دیئے تو یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں۔ یہ لوگ بھی قومی ہیرو شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی وفاداری کے لیے حکومت برطانیہ کے نوٹ ہی کافی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسلام کے قلعے پاکستان میں بھی یہ لوگ حاکم و سلطان تھے۔ یہی لوگ وفا اور دغا کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے تھے جن کی وفاداری سرکارِ انگلیشیہ کے عہد میں بھی مشکوک تھی، آج بھی مشکوک ہے:

ہر اک دور کے آقا غلام ابن غلام
ہر اک عہد کی تاریخ چند سودائی

Scanned with CamScanner

مولانا حسین احمد مدنی انہیں مشکوک اور مبغوض افراد میں سرِفہرست نظر آتے ہیں۔ جیلیں کاٹنے والے لوگ ان کا تذکرہ عقیدت اور محبت سے کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ ایسے لوگوں کی کون سنتا ہے لوگ تو ان ''اکابر'' کی عقیدت سے سرشار ہیں جنہوں نے سرکار سے عہد وفا نبھایا۔ یہ چاہے سر آغا خاں کے امتی ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی ہوں، چاہے مرزا غلام احمد کے امتی سر ظفر اللہ ہوں۔ یہ دونوں لوگ مجاہدین آزادی ٹھہریں تو مولانا حسین احمد کیا کہلائیں گے؟ سر ظفر اللہ ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی اور جوگندر ناتھ منڈل سرفروش کہلائیں تو مولانا حسین احمد کو برے القابات ہی زیبا ہیں۔ وہ بیچارے سالہا سال قید کاٹ کر بھی وہی کچھ کہلائیں جو کچھ یہ اکابر انگریزی سرکار کے در کی جبہ سائی میں پا چکے ہوں تو یہ ان سے ظلم ہوگا۔ ہمارے قلمکاروں کا حسنِ کرشمہ ساز جنوں کا نام خرد ڈال دیں تو خرد کو جنوں کہلانے میں شرمندگی کیا۔

مولانا حسین احمد رحمۃ اللہ علیہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں اپنے استاد محترم شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز کے ہمراہ گرفتار ہو کر مالٹا میں داخلِ زنداں ہوئے۔ یہ عرصہ زندانی چار سالوں پر محیط تھا۔ اُستادِ عمر کے آخری حصے میں تھے۔ مالٹا کی قید ان کی آخری اسیری ٹھہری کہ ان کی عمر کی نقدی ختم ہوئی۔ مولانا حسین احمد کی اسارت کی یہ ابتدا تھی۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور عمر بھر چلتا رہا۔ تحریک خلافت میں آپ کو دِس سال قید کی سزا ہوئی تھی جس پر یہ شعر فوک ہو گیا تھا:

یہ کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو چلے ہیں دس دس برس کو

مولانا حسین احمد کا یہ قصہ تو تاریخ کے طالب علم کبھی بھلا نہ سکیں گے کہ ایک دفعہ کسی مجسٹریٹ نے آپ کو ایک حکم نامہ دیا اور وصولی کے لیے دستخط کرنے کو کہا۔ آپ نے کہا کہ قلم دیجیے۔ اس نے آپ کی جیب میں موجود قلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ قلم تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آپ نے کہا کہ میں ترکِ موالات کر چکا ہوں۔ اپنا قلم سرکاری کام کے لیے کیوں استعمال کروں۔ یہ اصول کے خلاف ہے۔ ایسے ہی ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے آپ کو دستار پیش کی آپ نے دستار سر پر رکھ کر واپس کر دی۔ فرمایا: آپ کا تحفہ سر آنکھوں پر، لیکن میں صرف کھدر کی پگڑی باندھتا ہوں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کھدر کی دستار منگوا کر آپ کو پیش کی۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے اخلاف کا کمال ہے کہ انھیں بعد از مرگ مسلم لیگی بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ سے دور کا تعلق بھی نہ رکھتے تھے، مگر یہ اخلاف کا کمال ہے کہ انہیں ان کے اصولوں کے برعکس جعلی خط کے ذریعے مشرف بہ مسلم لیگ کر دیا گیا۔ یہ لوگ آخر حضرت تھانوی کے ورثاء تھے۔ ان کے اموال پر تصرف کا حق رکھتے تھے، احوال پر تصرف کر لیا تو کیا برا کیا۔ حضرت تھانوی

Scanned with CamScanner

کو حضرت مدنی سے جو محبت اور عقیدت تھی، وہ تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی بالوضاحت لکھ چکے ہیں۔ ہم کیا عرض کریں گے۔ اب اگر جان کی امان پائیں تو یہ بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت والا نے جن لوگوں سے خلافت واپس لی تھی، ان میں دو ایسے نام بھی آتے ہیں جو تحریک پاکستان کے قائدین شمار ہوتے ہیں۔ جناب مولانا ظفر احمد عثمانی کا قصہ تو ہر کسی کو معلوم ہے، دوسری برگزیدہ ہستی کا نام لیتے ہوئے میری عقیدت رکاوٹ بن رہی ہے۔ ان کا نام مجھے مولانا وکیل احمد شیروانی نے بتایا تھا۔ اگر کسی کو اصرار ہے تو وہ انھیں سے دریافت کرلے۔

ان دنوں مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ کے فتویٰ وغیرہ کا تذکرہ بھی خوب ہوتا ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ اس خاکسار کے سامنے بہت بلند مرتبہ ہستی ہیں۔ اس خاکسار کی کیا مجال جو ان سے اختلاف کر سکے۔ وہ گراں مایہ، میں فرومایہ۔ ان کے فتویٰ پر اگر کسی بزرگ نے استرداد کیا تو انھیں اس کا حق حاصل ہے۔ وہ اگر حضرت مدنی سے اختلاف کر سکتے ہیں تو ان سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مشینی ذبیحہ کے حق میں فتویٰ دیا تھا تو مولانا مفتی محمود علیہ الرحمہ نے اسکی تردید کی تھی۔ اہلِ علم نے مولانا مفتی محمود کے فتویٰ پر اتفاق فرمایا تھا۔ یہ دو مفتیوں کا علمی اختلاف ہے۔ اسے بنیاد بنا کر کسی عامی شخص کو منہ کھولنا زیبا نہیں۔ اب رہا مولانا محمد تقی عثمانی کا معاملہ تو مولانا محترم جب تک بینکوں کی مشاورت فرما رہے ہیں۔ ہم ان سے دینی رہنمائی حاصل کرنے سے معذرت خواہ ہیں۔ سنا ہے مولانا مفتی منیب الرحمٰن بھی بینکوں کے مشیر ہیں۔ اللہ کریم ان لوگوں کو اس فتنے سے نجات دے۔

ہمارے محترم مولانا احترام الحق تھانوی ہمارے مخدوم خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی کے صاحبزادے ہیں۔ ویسے تو مولانا احتشام الحق تھانوی کے بہت سے صاحبزادے ہیں۔ ان صاحبزادگان عالی قدر کا کمال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے والد پر رسالے کا خاص نمبر چھاپ کر مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ کو منہ بھر کر گالیاں دے چکے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی کو بھی بہت کچھ سنا چکے ہیں۔ ویسے مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کی دوستداری مسلّم ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے دوست عبیداللہ علیم (جو عقیدے کے اعتبار سے قادیانی تھے اور پیشے کے اعتبار سے ان کے مبلغ تھے) کے حق میں تین سو تیرہ علما کا خط لکھوایا تھا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے ایوب خان مرحوم کو امام ضامن باندھا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرنے والوں کی روحوں کو نہ شرمائے۔ ہم حسن ظن رکھتے ہیں ان کے عمل کی تاویل تلاش کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ مولانا محمد تقی عثمانی حضرت سندھی اور حضرت مدنی کو معاف کر دیں گے۔ رہا ہمارا معاملہ تو ہم بزرگوں کے معاملات پر خاموش رہتے ہیں، چاہے سرکاری زمین پر ناجائز قبضے کا معاملہ ہو۔

ہمیں رہ رہ کر خیال آرہا ہے کہ صاحبزادگانِ عالی قدر تو ان دنوں ایم کیو ایم میں ہیں۔ مولانا محمد تقی

Scanned with CamScanner

عثمانی ہوں یا مولانا احترام الحق تھانوی یہ سب حضرات ایم کیو ایم میں شامل ہیں، یا اس کے ہمدرد یا ہمنوا ہیں۔ ایم کیو ایم پاکستان میں کم از کم مسلمان قومیت کی قائل نہیں۔ ایم کیو ایم پاکستان میں چار پانچ قوموں کی قائل ہے اور اوطان کی بنیاد پر قومیت کی قائل ہے، کم از کم ایمان کی بنیاد پر قومیت کی قائل نہیں۔ گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے دار العلوم کراچی کے دارالافتا سے گزارش ہے کہ وہ واضح فرمائیں کہ مولانا مفتی محمد شفیع کا فتویٰ درست تھا یا جناب الطاف حسین کا فلسفہ اور فرمان واجب الاذعان درست ہے۔ یہ تو مفتیان کرام کا معاملہ ہے۔ خاکسار کے پاس تو صرف یہ گزارش ہی رہ جاتی ہے:

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین بیچ اس مسئلے کے......

بات دور نکل گئی۔ حامد میر صاحب سے بات چلی تھی اور کہاں جا نکلی۔ حامد میر کو دعویٰ ہے کہ وہ علما سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ افسوس کسی عالم نے انہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ ان دنوں جتنے علماء حلقہ دیوبند میں موجود ہیں ان کی حیثیت حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے عیال کی ہے۔ مولانا عبید اللہ مہتمم جامعہ اشرفیہ، مولانا محمد شریف جالندھری (مولانا محمد حنیف جالندھری مہتمم خیر المدارس کے والد) اور مولانا سلیم اللہ خان تینوں حضرات کے والد یا مربی حضرت تھانوی کے خلفاء تھے۔ تینوں کو حضرت تھانوی کے حکم پر دار العلوم دیوبند بھیجا گیا۔ حضرت تھانوی نے یہ حکم ارشاد کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''جب تک مولانا حسین احمد دیوبند میں موجود ہیں، دورۂ حدیث کے لیے کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

راقم نے یہ ہدایت اُستاذ مکرم حضرت مفتی محمد عیسیٰ خاں سے سنی، انھیں مولانا سلیم اللہ خان نے یہ واقعہ روایت کیا۔ اس روایت میں مذکور دو بزرگ زندہ ہیں۔ وہ اس روایت کی تردید کردیں تو راقم اپنی تصحیح کر لے گا۔ بہر حال یہ تینوں بزرگ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کے شاگرد ہیں۔ مولانا احترام الحق تھانوی کے دل میں اسلاف کا کچھ بھی احترام باقی ہو تو وہ یہ بھی یاد فرمائیں کہ ان کے والد خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی نے دورۂ حدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ سے کیا تھا۔ اب اگر انھیں حضرت مدنی کے مقابلے میں حامد میر سے یکجہتی پسند ہے تو خدا انھیں وہیں خوش رکھے۔ ہم تو دنیا اور عاقبت میں حضرت مدنی کی رفاقت کی دعا مانگتے ہیں۔ مولانا احترام الحق اگر دنیا اور عاقبت میں حامد میر کی رفاقت کی دعا مانگتے ہوں تو ہمیں کیا اعتراض۔

حضرت مدنی علیہ الرحمہ آزادی خواہوں کی جماعت کے برگزیدہ شخص تھے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا میں وہ جیل گئے تھے جنگ ختم ہوئی تو بھی وہ جیل گئے تھے۔ اب بھلا کون ہے جو انہیں بھلا کہنے کی جرأت کرے۔ ہاں ایسی ہستیوں کی مدح وستائش میں قلم توڑا جا سکتا ہے، ہمیں شاعر کی حسن نیت پر اعتراض نہیں، مگر شعر بہر حال ایڈوائر کی تعریف میں ہیں۔ جنھوں نے جنرل اڈوائر کی مدح میں اس قسم کے

Scanned with CamScanner

اشعار کہے تھے

اے تاجدار خطۂ جنت نشاں ہند
روشن تجلیوں سے تیری خاوراں ہند
ہنگامہ وغا میں میرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

ایسے لوگ بھی روحانی پیشوا کہلاتے تھے اور اب بھی کہلاتے ہیں جنہوں نے جنرل اڈوائر کو خطبہ استقبالیہ پیش کیا تھا اور اسے ''حضور پرنور'' کے لقب سے یاد کیا تھا۔ اظہار یکجہتی کرنے والے علماء سے گزارش ہے کہ کیا فرماتے ہیں وہ بیچ اس مسئلہ کے...... پہلی جنگ عظیم سے پہلے حضرت مدنی چار سال سے زیادہ عرصہ مالٹا کے جزیرے میں اپنے استاد کے ہمراہ قید رہے تھے۔ ان کے برعکس بعض لوگوں نے فوجی بھرتی دی تھی اور مریدوں کو قیمتاً وہ تعویذ عطاء کیے تھے جو ترکوں کی گولیوں سے ان کی حفاظت کرتے۔ ان بزرگان دین نے فوجی بھرتی کے عوض جاگیریں اور مربع لیے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے فوجی بھرتی کے خلاف فتویٰ دے کر قید سہی تھی۔ بتایئے مُلا کون اور مجاہد کون؟ یقیناً جاگیریں مربع لینے والے ہی مجاہد کہلا سکیں گے:

جو چاہے سو آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

حامد میر صاحب نے مولانا فضل الرحمٰن پر قلم زنی کرتے کرتے کوسنے دینے شروع کر دیئے۔ اُن کے اکابر کو اپنی لپیٹ میں لے آئے۔ موصوف نے مولانا السید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ پر نقد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ممتاز مورخ جہانگیر تمیمی اپنی کتاب زوال سے اقبال تک میں لکھتے ہیں، آگے وہ الزام دہرادیا جو مرزا ابوالحسن اصفہانی حضرت والا پر عائد کر چکے ہیں۔ پڑھ کر ذہن چونکا۔ الزام اگرچہ پرانا تھا، مگر حوالہ تو نیا تھا۔ یہ تو اُس استاد والی بات ہوگئی جسے دی۔سی نے نئے نوٹس تیار کرنے کا حکم صادر کیا تو موصوف نے پرانے نوٹس نئی ڈائری میں خوشخط لکھ ڈالے۔ اب یہ ممتاز مورخ کی پھبتی بھی خوب رہی۔ جہانگیر تمیمی بیچارے مورخ ہی نہیں، ممتاز کہاں سے ہو گئے۔ انہوں نے تین مضمون لکھے جن کا نہ سر ہے نہ پیر، کہیں کی بات کہیں جا لگی ہے۔ صفحوں کے صفحے حوالہ جات کے ہیں، بیچ میں کہیں کہیں ان کا ٹکڑا بھی ہے۔ حضرت مدنی پر ان کا حوالہ دراصل مرزا ابوالحسن اصفہانی کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ میر صاحب کے لیے بہتر تھا کہ وہ اصفہانی کا حوالہ دیتے کہ علمی دنیا میں بنیادی مأخذ ہی حوالہ جاتی کتاب ٹھہرتے ہیں۔ ثانوی مأخذ تو کسی طرح بھی معتبر نہیں ہو سکتے، وہ بھی جہانگیر تمیمی جیسے مصنفین کے، جن کی کوئی Achievement سامنے نہ آئی ہو۔ میر صاحب نے اصل کتاب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ یہ ان کی مرضی، مگر تاریخ کے حوالے سے بات کرنی ہو تو بہتر ہے اصل کتاب کا حوالہ دیا جائے۔

Scanned with CamScanner

جناب ریاض درانی نے اپنے مکتوب میں حامد میر کو حقیقت سمجھانا چاہی تو وہ اور سیخ پا ہو گئے اور لگے اس انداز میں بات کرنے جو شرفا کے ہاں مروج نہیں۔ انھوں نے ادھر ادھر کی کہنا شروع کر دیں۔ موصوف فی الفور نئی گواہیاں لے کر تشریف لائے۔ اب نئی گواہیاں کیا تھیں، وہ بھی سن لیجیے، فتح محمد ملک اور خلیفہ عبدالحکیم۔ فتح محمد ملک کے تعارف کے لیے ان کے نام کے ساتھ ریکٹر اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد لکھا اور پورے اہتمام سے لکھا۔ خدا جانے ان کا مقصد اپنے دعوے کو پختہ کرنا ہے یا ان کا عہدہ بتا کر نظام تعلیم کے زوال کے اسباب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اب خدانخواستہ ایک جھوٹ اس لیے سچ نہیں ہو سکتا کہ ایک ریکٹر صاحب نے اس کا دو دفعہ حوالہ دیا ہے۔ وہ چار دفعہ یا چار سو دفعہ بھی یہ حوالہ پیش کرتے تو بھی یہ سچ نہ ہو پاتا۔ رہا محترم فتح محمد ملک کا اقبال شناس ہونا تو اس کے متعلق ابھی یہ بات طے کرنا باقی ہے کہ آں محترم کی اِقبال شناسی ہائیڈل برگ کی اِقبال چیئر سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ اس چیئر کا کمال ہے کہ اس نے بڑے بڑوں کو اقبال شناسی پہ مائل کیا۔ ممکن ہے فتح محمد ملک ان میں سے نہ ہوں۔ ویسے فتح محمد ملک جناب حنیف رامے کی دریافت تھے۔ خیر ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ مجھے تو پروفیسر مہدی حسن کی بات یاد آ رہی ہے جو انہوں نے ڈاکٹر تاثیر کی کتاب کے حوالے سے ہونے والی تقریب میں کہی تھی کہ :

اگر یہ استاد اتنے ہی باکمال تھے تو یہ لوگ کوئی اچھی نسل کیوں تیار نہ کر سکے۔

بہر حال یہ باتیں لایعنی ہیں کہ فلاں نے فلاں کا دو مرتبہ حوالہ دیا اور فلاں نے چار دفعہ یا فلاں نے آٹھ دفعہ۔ دنیائے علم میں شخص اہمیت نہیں رکھتا، دلیل اہمیت رکھتی ہے۔ فتح محمد ملک کا نام لینے سے کوئی بات مستند نہیں ہو سکتی۔ اب رہا خلیفہ عبدالحکیم کا حوالہ تو میر صاحب آپ بار بار بجھارتیں نہ بجھوائیں کہ جہانگیر تمیمی نے مرزا ابوالحسن اصفہانی کا حوالہ یوں پیش کیا ہے یا فتح محمد ملک نے یہ حوالہ دو بار پیش کیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص آپ کی بات کا حوالہ دو یا چار دفعہ پیش کر دے تو کیا آپ کی بات معتبر ہو جائے گی۔ اب یہ ایک نئی بجھارت ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کا یہ حوالہ فتح محمد ملک نے پیش کیا ہے۔ اب براہ راست بتائیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کیا جواہر لال کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ ان کا حوالہ پیش کرنے کا تک ہی کیا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ حامد میر نے خلیفہ عبدالحکیم کے حوالے سے یوں لکھا ہے تو وہ ایک لایعنی بات کو مزید بے معنی کرنے کا رویہ ہوگا۔

اب آیئے خلیفہ عبدالحکیم کا قصہ بھی سن لیں۔ موصوف سرد جنگ کے زمانے کی پیداوار تھے۔ وہ بھی امریکی رضا اور مفاد کا اسلام پیش کرنے کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تھے۔ انھیں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے مقرر کیا تھا۔ غلام محمد ملک نے پاکستان کے بارے میں امریکا کو کیا آفر دیا تھا۔ آپ خود دستاویزات نکال کر پڑھ لیں ہمیں ارشاد کریں کہ ہم آپ کو وہ حوالہ پیش کر دیں کہ ایک

Scanned with CamScanner

سابق بیوروکریٹ کس طرح ملک وقوم کا سودا کر رہا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اسی ملک غلام محمد کی پیداوار تھے۔ وہ ایک طرف سوویت یونین کے کیونزم کے خلاف قلم زنی کر رہے تھے، دوسری طرف اِقبال اور مُلّا لکھ کر مولوی کے خلاف گوہرافشانی فرمارہے تھے۔

اب آیئے پنڈت جواہر لال کے خط کی طرف تو یہ وہ جعلی کارروائیاں ہیں جو علماء کو بدنام کرنے کے لیے جعلسازوں نے سرانجام دیں۔ آپ براہِ کرم مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی کتاب شاہراہِ پاکستان کی ورق گردانی کریں۔ وہ مولانا حسین احمد رحمہ اللہ کے خلاف ہر قسم کے الزام کی تردید کرتے ہیں۔ ان کی گواہی براہِ راست ہے۔ انھوں نے مولانا حسین احمد کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔

## اصفہانی کا الزام...... منظر و پس منظر:

حضرت مدنی سے متعلق پچاس ہزار روپے مانگنے کا الزام سب سے پہلے اسماعیلی مذہب سے تعلق رکھنے والے سرمایہ کار جناب ایم۔اے۔ایچ۔اصفہانی نے عاید کیا۔ جناب اصفہانی لکھتے ہیں:

''پارلیمنٹری بورڈ کے جلسے کے دوران کئی تقریریں ہوئیں جو ہمارے تقریر کرنے کے روایتی شوق کے عین مطابق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کی اس تحریک پر کہ مسلم لیگ کو زندہ سیاست کے اکھاڑے میں لایا جائے، خوشنودی کا اظہار کیا، لیکن آخری روز ان دو عالموں میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی چونکہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ کی کامیابی کے لیے مسلسل پروپیگنڈے کی ضرورت ہوگی، لہٰذا دیو بند اپنے تمام ذرائع لیگ کی خدمت میں پیش کردے گا بشرطیکہ پروپیگنڈے کا خرچہ مسلم لیگ برداشت کرے۔ اندازہ یہ لگایا گیا کہ شروع میں کوئی پچاس ہزار روپے درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلم لیگ کے صندوق میں پچاس تانبے کے سکے بھی نہ تھے۔ صدر اور سیکرٹری جو دونوں اعزازی تھے اپنے دفتر اپنے تھیلوں میں اٹھائے پھرتے تھے۔'' (قائداعظم میری نظر میں، صفحہ:۳۰)

آپ آگے چل کر لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؤں کو اس سے مایوسی ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ ہندو کانگریس کی طرف ڈھلتے گئے اور کانگریس پارٹی کے لیے پرچار کرنے لگے جو ظاہر ہے کہ ان کے مالی تقاضے پورے کرسکتی تھی۔ یہ میرے لیے ایک تلخ صدمے کا باعث ہوا کیونکہ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ خود علمائے دین مسلمانوں کے راستے میں، جو اپنی قومی آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے، حائل ہوجائیں گے۔'' (حوالہ مذکور، صفحہ:۳۰، ۳۱)

جناب جہانگیر تمیمی نے یہ دونوں حوالے اصفہانی صاحب کی کتاب کے اردو ترجمے سے لیے ہیں اور ان پر نقد و جرح کیے بغیر اور صورتِ حال کا تجزیہ کیے بغیر انھیں علمائے کرام کے خلاف پروپیگنڈے

Scanned with CamScanner

کے لیے استعمال کیا ہے۔ جبکہ تقسیم ہو جانے کی بعض کوششیں ہوئی ہیں۔

آج کے قاری کے لیے ۱۹۳۶ء کی مسلم سیاست کی صورت حال کو سمجھنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اس سال کے فصل زمانی نے حقائق پر بہت سی گرد ڈال دی ہے۔ واقعات حالات کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی اہمیت کو واضح کیا جائے کہ اس وقت کی سیاسی صورت حالات میں مسلم لیگ کی اپنی کیا اصل صورت تھی؟ یہ بات جناب اصفہانی سے ہی پوچھ لیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''اس وقت مسلم لیگ کوئی قابل ذکر جماعت نہ تھی، بلکہ بہت ساری منتشر ہو رہی تھی۔ اس لیے مسٹر جناح نے جناب عبدالرحمن صدیقی کو اور مجھے نامزد کیا اور کہا کہ یہ کام ہم پر ہے کہ ہم بنگال میں مسلم لیگ پارٹی قائم کریں''۔ (حوالہ مذکور صفحہ ۲۹)

اس سے پہلے اصفہانی یہ بھی وضاحت کر چکے ہیں:

ہم (عبدالرحمن صدیقی اور اصفہانی) مسلم لیگ کے رکن نہیں تھے، بلکہ یونائیٹڈ مسلم پارٹی کے رکن تھے یعنی ایک ایسی جماعت کہ جس نے اس وقت تک اپنی سرگرمیوں کو بنگلے کے باہر نہیں پھیلایا تھا۔ تاہم ہم بہت خوشی سے اپنے بورڈ کے سامنے یہ تجویز پیش کریں گے کہ ہم لوگ اس کل ہند تنظیم میں ضم ہو جائیں گے بشرطیکہ ہمیں یہ اطمینان ہو جائے کہ مسلم لیگ نہ صرف زبانی، بلکہ عملی طور پر ان آرام کرسی نشین سیاست والوں کی جماعت نہ رہے گی جس کی سرگرمی اب تک سال میں ایک یا دو دفعہ جلسے کرنے، کچھ تجاویز منظور کرنے اور ہمارے فرمانرواؤں کی خدمت میں اس مضمون کی درخواستیں اور سفارشیں پیش کرنے تک محدود رہی ہیں۔ وہ ان بے انصافیوں کا تدارک کریں جو ہندوستان کی کسی زمانے میں با عظمت مسلم قوم کے ساتھ کی جاتی رہی ہیں۔'' (حوالہ مذکور، ۲۸،۲۹)

پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس میں بہت سی جماعتوں کے راہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان جماعتوں میں جمعیۃ العلماء، مجلس احرار اسلام، مسلم یونٹی پارٹی، کرشک پرجا پارٹی اور دیگر پارٹیاں۔ کیفیت یہ تھی کہ مسلم لیگ کے علاوہ پارلیمانی بورڈ میں بہت سے ارکان کا تعلق جمعیۃ العلما اور احرار سے تھا۔ اس وقت مسلم لیگ کی دعوت کو کوئی جماعت قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ خصوصاً یو۔ پی کی زمیندارہ لیگ، پنجاب کی یونینسٹ پارٹی وغیرہ۔ یہ کہانی بھی اصفہانی سے سن لیتے ہیں:

''بنگال کے جن راہنماؤں کو بلاوا بھیجا گیا تھا، ان میں سے صرف ہم دو (عبدالرحمن صدیقی اور اصفہانی) ہی نے اسے منظور کیا تھا اور پورے ہندوستان بھر میں سے صدر مسلم لیگ کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ آسام سے صرف ایک یا دو نے دعوت قبول کی۔ ان میں سے ایک طبعی طور پر پارلیمنٹری بورڈ کے اعزازی سیکرٹری عبدالمتین چودھری تھے۔ اس صوبے کے باقی

Scanned with CamScanner

راہنماؤں مثلاً سر سعد اللہ نے کوئی توجہ نہ کی کیونکہ وہ خود اپنے لیے اپنے صوبائی میدان کو ہموار کرنے میں مشغول تھے۔ سب سے بڑا اور بااثر جتھا یو۔ پی سے آیا جس میں مولانا شوکت علی، نواب اسماعیل خاں، نوابزادہ لیاقت علی خاں، راجا صاحب محمود آباد، چودھری خلیق الزماں، راجا صاحب سلیم پور اور فرنگی محل کے مولانا عنایت اللہ شامل تھے۔ بعد ازاں لیاقت علی خان نے جو آگے چل کر پاکستان کے ایک رکن رکین ثابت ہوئے اور ان کے ساتھ نواب صاحب چھتاری اور نواب محمد یوسف نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (حوالہ مذکور، صفحہ: ۲۵)

اس اجلاس میں پنجاب سے ڈاکٹر محمد اقبال، ملک برکت علی، میاں عبدالعزیز، راجا غضنفر علی اور مظفر قزلباش شریک ہوئے۔ جلد ہی مظفر علی قزلباش بھی مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ گئے اور راجا غضنفر علی یونینسٹ پارٹی میں جا بسے اور قیام پاکستان تک وہیں قیام پذیر رہے۔

۱۹۳۶ء کے الیکشن میں جمعیۃ العلماء مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی میں کیوں شامل ہوئی۔ اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ جمعیۃ العلما مدتوں سے مکمل آزدی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کو نہرو رپورٹ پر یہ اعتراض تھا کہ اس میں مکمل آزادی کی بجائے حق خود اختیاری طلب کیا گیا ہے۔ جمعیۃ العلماء نے ۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو اپنے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں نہرو رپورٹ پر تنقید کرتے ہوئے جو پہلی قرارداد منظور کی، اس میں کہا گیا تھا:

> نہرو رپورٹ میں ہندوستان کے لیے حکومت بطرز نوآبادیات کے مطالبہ پر قناعت کی گئی ہے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ اس میں کسی جماعت کے لیے آزادی کامل کی جدوجہد کرنے کا دروازہ بند نہیں ہے تاہم مجلس عاملہ کے لیے اس کی تصدیق مشکل ہے، کیونکہ جمعیۃ علماء اپنے اجلاسوں میں ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے چکی ہے اور جمعیۃ عاملہ کے اختیار سے باہر ہے کہ وہ اس نصب العین کے خلاف کسی تجویز کی تصدیق کرے۔

(جمعیۃ العلماء ہند دستاویزات مرکزی اجلاس، مرتبہ، پروین روزینہ، صفحہ: ۴۸۵)

جمعیۃ العلما کا بنیادی نظریہ کامل آزادی تھا۔ یہ اُس وقت سے تھا جب کانگریس ابھی دور نوآبادیات کے اختیار مانگ رہی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جب مسلم لیگ کا احیاء کیا جا رہا تھا، مسلم لیگی قیادت نے جمعیۃ العلماء کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا تو انہوں نے لامحالہ یہ مطالبہ کرنا تھا اور کیا کہ سروں اور خان بہادروں کو مسلم لیگ سے بارہ پتھر باہر رکھا جائے۔ انہوں نے خصوصیت سے یہ مطالبہ کیا کہ نواب چھتاری کی پارٹی کے لوگوں کو اس بورڈ میں شامل نہ کیا جائے۔ اسی کا ردعمل تھا کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کو چھوڑ کر نواب چھتاری کی پارٹی میں چلے گئے۔

Scanned with CamScanner

عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

''یو۔ پی سے نواب چھتاری، سر محمد یامین اور نوابزادہ لیاقت علی خاں مرکزی بورڈ کے ممبر نامزد کیے گئے تھے، لیکن اب ان تینوں نے بورڈ سے استعفا دے دیا اور مسلم لیگ کی بجائے نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ یو۔ پی کی یہ ایگریکلچرل پارٹی پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا ثانی اور ہمزاد تھی۔ نوابزادہ لیاقت علی کے استعفا نے عجب صورت حال پیدا کردی تھی۔ ابھی چند مہینے قبل وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منتخب کیے گئے تھے۔ اب ان کے استعفے کے بعد لیگ کا کوئی سیکرٹری نہ تھا۔'' (اقبال کے آخری دو سال، صفحہ:۳۴۲)

یہ وہی جنرل سیکرٹری تھے جنھوں نے، بقول مرزا ابوالحسن اصفہانی، مسلم لیگ کے دفتر کو تھیلے میں ڈال رکھا تھا۔ گویا وہ یہ کہہ کر نواب چھتاری کی پارٹی میں چلے گئے:

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

۱۹۳۷ء کے الیکشن میں مقابلہ مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین نہ تھا، بلکہ مسلم لیگ اور کانگریس حلیف جماعتیں رہیں۔ الیکشن میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی حد تک قرب رہا اور جزوی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے تعاون کیا۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ کا مقابلہ مسلمان نوابوں، خان بہادروں اور سروں سے تھا جنھوں نے ہر صوبے میں زمینداروں کی ایک پارٹی الگ سے بنا رکھی تھی۔ اصفہانی لکھتے ہیں:

''کانگریس اور مسلم لیگ کے امیدواروں میں ایک دوسرے کو اخلاقی مدد دینے کا ایک قسم کا سمجھوتا ہو گیا تھا کیونکہ کانگریس کو مسلم حلقوں میں کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی اور نہ ہی اس کو زیادہ یقین تھا کہ اسے عام نشستوں میں سے بیشتر مل جائیں گی۔ انتخابی معرکے کے دوران میں مسٹر جناح اپنی تقریروں میں بار بار کانگریس سے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرتے رہے اور لیگ اور کانگریس کی دوستانہ شرکت عمل پر زور دیتے رہے۔ مثلاً ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہماری تحریک کوئی معاندانہ تحریک نہیں ہے، بلکہ ایسی تحریک ہے جو ہر فرقے سے امن و صلح کی خواہاں ہے۔ ہم تعاون پر تیار ہیں، بلکہ کسی جماعت یا جماعتوں سے اشتراک کے لیے بھی تیار ہیں بشرطیکہ ان کے تصورات اور مقاصد قریب قریب وہی ہوں جو ہمارے ہیں''۔ (حوالہ مذکور، صفحہ:۴۱، ۴۲)

جناب اصفہانی کا یہ بیان یقیناً چشم کشا ہونا چاہیے۔ ویسے تو سجاد ظہیر کے ہاں یہ حوالہ بھی ملتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مختلف جلسوں میں خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ کی حمایت کریں۔

۱۹۳۷ء کے الیکشن ہو چکے تو فضا بدلنے لگی۔ اس بدلی ہوئی فضا میں کانگریس نے کیا رویہ اپنایا، یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ فی الحال مسلم لیگ کی صورتِ حال زیرِ بحث ہے۔ جونہی الیکشن ختم ہوا،

Scanned with CamScanner

وزارتیں وجود میں آئیں تو مسلم لیگ نے اپنے پھیلاؤ کے لیے نئے فیصلے کیے۔ یہ نئے فیصلے کیا تھے، ان کی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف نتائج ہی بیان کیے جاتے ہیں۔

(۱)......نوابزادہ لیاقت علی خاں دوبارہ مسلم لیگ میں آبراجے اور پھر سے سیکرٹری جنرل ہو گئے۔

(۲)......تین صوبوں کے وزرائے اعظم مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ وزرائے اعظم تھے آسام کے سرسعد اللہ، بنگال کے اے کے فضل الحق اور پنجاب کے سر سکندر حیات۔

(۳)......نواب چھتاری کی زمیندارہ لیگ مسلم لیگ کے ساتھ آملی تھی۔ یہ لوگ مسلم لیگ میں آئے تو کچھ دوسرے لوگوں کو مسلم لیگ سے نکلنا پڑا یا مسلم لیگ نے خود انہیں نکال باہر کیا۔ زیادہ تفصیل تو غیر ضروری ہے۔ پنجاب سے مسلم لیگ کی جو تنظیم علامہ اقبال کے زیرِ سرپرستی کام کرتی تھی، کا مرکزی مسلم لیگ نے الحاق نامنظور کر دیا۔ کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو یہ لوگ نہ بلائے گئے۔ یہ گروہ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے کلکتہ پہنچا۔ وہاں اجلاس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

> ''نوابزادہ لیاقت علی خاں نے پہلے گزشتہ اجلاس کی رپورٹ سنائی پھر صوبائی لیگوں کے الحاق کی درخواستوں کا معاملہ زیر بحث آیا تو کئی ایسی لیگوں کی درخواستیں منظور کر لی گئیں۔ جن کا وجود محض کاغذی تھا اور جن کا کوئی آئین بھی نہیں تھا۔ صوبہ سرحد کی بھی ایک نام نہاد لیگ کا الحاق منظور کیا گیا، حالانکہ خود آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نے اُس وقت اسے تسلیم کیا کہ اُس لیگ کا وجود صرف کاغذی ہے اور اس کا دستور بھی تا حال وضع نہیں کیا گیا، لیکن جب پنجاب کی طرف سے الحاق کی نئی درخواست پیش ہوئی تو نوابزادہ لیاقت علی خاں نے مخالفت کی اور کہا کہ یہ درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔ (حوالہ مذکور، صفحہ: ۶۱۳، ۶۱۴)

یہ کن لوگوں کی درخواست تھی......ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جو ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں لیگ کے لیے کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب بھر سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر راجا غضنفر علی خاں اور ملک برکت علی الیکشن جیت سکے۔ سر سکندر کی یونینسٹ پارٹی نے جیت کر وزارت بھی بنالی۔ اب یہ مسلم لیگ میں آئے تو ۱۹۳۷ء کے لوگوں کے لیے مسلم لیگ کا حلقہ سکڑ گیا۔ یہ لوگ تھے، غلام رسول خاں، ملک برکت علی، ملک زمان مہدی اور عاشق بٹالوی۔ انہیں علامہ اقبال کی سرپرستی حاصل تھی، مگر سر سکندر حیات کی وزارت عظمیٰ کے سامنے ان کے چراغ نہ جل سکے۔ ۱۷/اپریل ۱۹۳۸ء کی شام ایک پینتیس رکنی آرگنائزنگ کمیٹی نامزد کی گئی جو پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم سازی کرے۔ اس میں پچیس ارکان سر سکندر کے نامزد کردہ تھے اور دس پرانی مسلم لیگ کے جن میں حضرت علامہ اقبال بھی شامل تھے، جو ۲۱/ اپریل کو راہی ملک بقا ہوئے۔ پرانے مسلم لیگیوں کے لیے یہ ایک داغ تھا جو ساری عمر ان کا المیہ بنا رہا۔

Scanned with CamScanner

عاشق بٹالوی آخری عمر تک یہی کہانی سناتے رہے۔ ویسے تو تقریباً ہر صوبے میں یہی ہوا۔ ۱۹۳۷ء کے مسلم لیگ کے رفقاء الیکشن کے بعد اس شعر کا مصداق ہو گئے یا کر دیئے گئے:

وہی منزلیں، وہی قافلے، وہی ہم سفر، وہی راستے
مگر اک لگن جو دلوں میں تھی، وہ لگن تو گردِ سفر ہوئی

مسلم لیگ والوں کے لیے بہتر تھا کہ یہ الیمہ کہانی نہ چھیڑتے اور خاموش رہتے، مگر پرانے لوگوں میں کچھ علماء بھی تھے۔ بہتر تھا کہ انہیں فراموش کر دیا جاتا کہ علماء یہ کہہ سکتے:

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو تو نے مجھے فراموش کر دیا

مگر علما کو معاف کرنا ہماری روایت نہیں۔ علماءِ دین نے مسلم لیگ کی رفاقت ترک کی تو اُس وقت کی مسلم لیگی قیادت نے جو کہا وہ ذرا بعد میں زیرِ بحث آئے گا۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی تو اُس وقت خاموش رہے یا ان کی آواز پر کسی نے کان ہی نہ دھرا۔ سالوں بعد خلیق الزماں کی شاہراہِ پاکستان شائع ہوئی تو انہیں خیال آیا کہ وہ بھی اپنی یادداشتیں قلمبند کریں۔ اُس وقت وہ سمجھتے تھے کہ وہ ایک بڑے لیڈر ہیں۔ ویسے بھی بڑے کہتے ہیں: کبرنا موت الکبراءِ بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا کر دیا۔ اتفاق یہ کہ بڑوں کی موت کے باوجود بھی مسٹر اصفہانی بڑے لیڈر نہ بن سکے۔ خیر خود کو بڑا سمجھنے میں آخر کیا برائی ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کتاب لکھی اور عنوان دیا:

**Quid-e-Azam As I Knew him** قائداعظم میری نظر میں

حالانکہ یہ کتاب ان کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ اس پر ایک محقق یاد آئے کہ انہوں نے فلسفہ مذہب پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا۔ اس کا شائع ہونا مشکل نظر آیا تو اس کا نام بدل کر اقبال کا فلسفہ مذہب کر دیا، حالانکہ اس کا صرف ایک باب اقبال سے متعلق ہے۔ ایسے ہی عاشق حسین بٹالوی نے اپنی سیاسی یادداشتیں اقبال کے آخری دو سال کے نام سے شائع کر دیں۔ یہ تفصیل اس لیے عرض کر دی کہ آئندہ لوگ بھی اس نسخے سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اصفہانی صاحب کو خود میں تو کوئی بڑائی کم ہی نظر آئی۔ ہاں وہ اقوامِ متحدہ میں اپنی ناکام جدوجہد کی داد طلب کرتے نظر آتے ہیں، حالانکہ یگانہ کہہ گئے ہیں:

کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

ان کی کتاب میں اپنی شان میں لکھے گئے قصیدے تو بہت تھے، مگر کسی کو ان میں خاک دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہاں ایک قصیدہ ہجو یہ تھا جو علماء سے متعلق تھا۔ اسے بہت سے لوگ لے اڑے۔ یہ وہ راز تھا جو ۱۹۳۶ء کے مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں جمعیۃ العلماء سے متعلق تھا۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی یہ راز

دل میں چھپائے پھرتے رہے۔ سوچتے رہے کہ اس اجلاس کے شرکاء دنیا سے چلے جائیں تو وہ یہ راز کھول سکیں۔ اس اجلاس میں پچیس چھبیس لوگ شریک ہوئے، کسی نے بھی تو یہ راز نہ کھولا۔ اُس وقت کے اخباروں نے بھی اس راز سے متعلق خاموشی اختیار کیے رکھی۔ یہ راز بس اصفہانی کے سینے کا دفینہ رہا۔ بالآخر ۱۹۶۶ء میں ان کی کتاب منظر عام پر آئی تو یہ راز کھل سکا۔ یہ وہ راز تھا جسے نہ مسٹر جناح جانتے تھے، نہ اس کوئی دوسرا شریک اجلاس۔ عارف شیراز نے کیا خوب کہا ہے:

سرِ خدا کہ عارف سالک بکس نگفت
بحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

''خدا کا بھید کہ عارف سالک نے کسی سے نہ کہا تھا۔ حیران ہوں کہ بادہ فروش نے کہاں سن لیا (اور جان گیا)''

اس کتاب کے پہلی بار شائع ہونے سے متعلق اس کے اردو ترجمے کے ناشر لکھتے ہیں:

''مرزا ابوالحسن اصفہانی کی کتاب Quid-e-Azam Jinnah As I Knew him پہلی مرتبہ جون ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔''

(جمیل الدین احمد، عرض ناشر، قائداعظم میری نظر میں) علماء سے متعلق کہانی صرف تیس سال بعد مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی یادداشت سے بیان کردی۔ اس کے لیے ریکارڈ کی کیا ضرورت تھی۔ انہوں نے علما سے پچاس ہزار روپے مانگنے کا واقعہ منسوب کرتے ہوئے فرمایا:

''مجھے یاد ہے......

اب کون ہے جو کہہ سکے کہ قبلہ آپ کو یاد رکھنے کی کیا ضرورت! آپ جو کچھ کہیں وہی برحق آپ اپنے حاضر امام کی تصدیق پیش کردیں گے تو ہم کیا کہہ سکیں گے۔ موصوف اسماعیلی نزاری تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ رب ذوالجلال حاضر امام میں حلول کیے ہوئے ہے۔ اب جس شخص کا یہ عقیدہ ہو، اُس کی یادداشت پر کون اعتراض کرسکتا ہے۔ ان حضرت کی خوش بختی کہ انہیں مقلد بھی خوب ملے۔ عاشق حسین بٹالوی نے بغیر ردوکد کے یہ طویل حوالہ اپنی کتاب اِقبال کے آخری دو سال میں ۳۰۵ سے ۳۰۷ صفحات تک نقل کردیا۔ ان کے ملک برکت علی سے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ ان سے پوچھا جاسکتا تھا۔ آخر انہوں نے اجلاس کے بعد اپنے دوست عاشق بٹالوی کو بھی کچھ بتایا ہوگا۔ اس اجلاس میں اتحاد ملت کے کچھ لوگ بھی تھے۔ ان لوگوں نے بھی کچھ بتایا ہوگا، مگر عاشق بٹالوی ان میں سے کسی کا حوالہ نہیں دیتے۔ سارا دروغ راوی ضعیف جناب مرزا ابوالحسن اصفہانی کی گردن پر ڈال کر دروغ کے فروغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ان دنوں جہانگیر تمیمی کو ممتاز مؤرخ ہونے کا شوق چرایا ہے تو انہوں نے بھی یہ حوالہ بطور سند نقل کردیا ہے۔ فتح محمد ملک نے بھی اس مکھی پر مکھی ماردی

Scanned with CamScanner

ہے۔ کسی نے ریکارڈ دیکھ کر یہ چیک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس اجلاس میں کون کون لوگ شریک ہوئے تھے۔ وہ صرف یہ چیک کر لیتے کہ مولانا حسین احمد مدنی وہاں موجود بھی تھے یا نہیں تو بات کھل سکتی تھی، مگر تحقیق کے لیے فرصت کہاں۔ ہماری ممتاز صحافی، ممتاز مورخ اور ممتاز مفکر سے درخواست ہے کہ وہ ریکارڈ چیک کر کے معلوم کریں کہ مولانا حسین احمد مدنی اس اجلاس میں شریک ہوئے تھا یا نہیں۔ انہیں یقیناً نفی میں جواب ملے گا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنی بات پر بضد رہیں تو ہم یہی کہہ کر بات ختم کر دیں گے:

مرادِ ما نصیحت بود و گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

"ہماری مراد نصیحت کرنا تھا، سو کہہ دی۔ اب تجھے خدا کے حوالے کیا اور ہم چلے۔"

اب آخر میں یہ مناسب رہے گا کہ علما کے مسلم لیگ سے دور جانے کی وجوہ مسلم لیگ کے قائداعظم اور مولانا حسین احمد مدنی سے سن لیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ علماء کا رقم مانگنا وہ راز ہے جو مسلم لیگ کی قیادت میں سے سوائے مرزا ابوالحسن اصفہانی کے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ۲۲ راگست ۱۹۳۷ء کو اخبارات میں ایک بیان اخبارات کی زینت بنا تھا۔ یہ بیان دیکھ لیجیے:

مولانا حسین احمد کا یہ سارا بیان از سرتاپا غلط ہے
قائد ملت مسٹر محمد علی جناح کا باطل سوز بیان

شملہ (۱۹ راگست) مسٹر محمد علی جناح نے مولانا حسین احمد دیوبندی کی ایک تقریر کے سلسلہ میں جو آخرالذکر نے ۱۵ راگست کو غازی آباد میں کی تھی، ایک بیان شائع کرایا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح لکھتے ہیں:

"مولانا حسین احمد کے متعلق میں نے سنا ہے کہ انہوں نے اپنی اس تقریر میں کہا کہ عام انتخابات کے موقع پر ہم نے مسلم لیگ کی اس لیے مخالفت نہ کی تھی کہ اس وقت ہمیں مسٹر جناح نے یقین دلایا تھا کہ مسلم لیگ کی پالیسی اب بدل گئی ہے اور مسلم لیگ اب آزادی کامل کی حامی ہے، لیکن انتخابات ختم ہو جانے کے بعد جب مسٹر جناح نے ہی یہ کہا کہ وہ گفتگو تو محض ایک سیاسی چال تھی تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ مسٹر جناح تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بیان از سرتاپا غلط ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جمعیۃ العلماء ہند کے بعض ارکان مسلم لیگ کے ساتھ مل گئے تھے اور لیگ کے امیدواروں کی انہوں نے کیوں تائید اور حمایت کی تھی اور پھر فوراً ہی وہ کیوں الگ ہو گئے میرے لیے خود ایک پراسرار معما ہے جسے میں حل نہیں کر سکا۔"

لیجیے صاحب! مسلم لیگ کے قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے بھی اپنا موقف پیش کر دیا اور بین السطور میں مولانا حسین احمد مدنی کا موقف بھی آ گیا۔ قائداعظم کے لیے یہ ایک پراسرار معما تھا۔ یہ معما

Scanned with CamScanner

صرف تیس سال بعد مرزا ابوالحسن اصفہانی نے حل کیا۔ انہوں نے شاید انتظار کیا ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی فوت ہو جائیں تو وہ یہ راز کھولیں۔ پھر سوچا ہوگا کہ اجلاس کے بقیہ شرکاء بھی واصل بحق ہو جائیں تو وہ ان راز ہائے درونِ خانہ سے پردہ اٹھائیں، مگر عجیب بات کہ ایک شریک مجلس چودھری خلیق الزماں زندہ تھے۔ انہوں نے اصفہانی کی تائید کرنے کی بجائے تردید کردی۔ انہوں نے مولانا حسین احمد کی دیانت داری کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا، اب وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔

اب پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جمعیۃ العلماء مسلم لیگ سے دور کیوں ہوئی۔ اس کے جواب میں مولانا حسین احمد مدنی نے ۳۶ صفحات کا کتابچہ تیار کیا تھا۔ اس کا ذیلی عنوان تھا:

## مسلم لیگ کی تاریخِ سیاہ اور علماء ہند کی علیحدگی

یہ کتابچہ اب شاید کسی مجموعے کا حصہ ہو چکا ہے۔ اس لیے اس سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ممتاز صحافی، ممتاز مورخ یا ممتاز ماہرِ اقبالیات اور ممتاز دانشور یا کسی یونیورسٹی کا ریکٹر ہونے کی بجائے تاریخ کا سچا طالب علم ہو تو وہ یقیناً وہ مجموعہ تلاش کر کے پڑھ سکے گا۔

## حامد میر کے دیگر حوالے:

حامد میر صاحب نے خلیفہ عبدالحکیم کا حوالہ دیا ہے۔ یہ اِقبال اور مُلّا سے فتح محمد ملک نے لیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے ایک ایسے خط کا حوالہ دیا ہے جسے الیکشن کے زمانے کی جعل سازی کہا جاسکتا ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے مولانا مدنی پر زمانہ انتخابات میں لگائے گئے الزامات کی تردید کردی تھی۔ اب ان کے بارے میں کچھ کہنا بے سود ہے۔

حامد میر نے شورش کاشمیری کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے فیضانِ اقبال میں نیشنلسٹ علماء کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔ حامد میر کو تکلیف ہوگی اور وقت کا ضیاع ہوگا، ورنہ ان سے عرض کرتے کہ حضرت وہ کون سے صفحات ہیں، جن میں نیشنلسٹ علما کی مخالفت کی گئی ہے۔ ہمیں تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی۔ ویسے بھی فیضانِ اقبال علامہ کے اقوال کا مجموعہ ہے اور بس۔ اس میں شورش کاشمیری نے تحقیق تو کی نہیں۔

شورش کاشمیری نے ایک کتاب اور بھی لکھی تھی۔ نام اس کا اقبالی مجرم ہے۔ اس کا ایک باب خلیفہ عبدالحکیم سے متعلق تھا۔ بہتر ہوگا کہ حامد میر یہ باب مطالعہ کرلیں، انہیں خلیفہ عبدالحکیم کے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔

مجھے شک ہے کہ حامد میر شورش کاشمیری کی کتاب بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل کا حوالہ دینا چاہتے تھے، فیضانِ اقبال کا حوالہ دے دیا۔ بوئے گل میں شورش کاشمیری نے نیشنلسٹ علما کا جس انداز

Scanned with CamScanner

اور لہجے میں تذکرہ کیا ہے، وہ بھی ذرا پڑھ لیا جائے تو بہتر ہے۔ پھر ان کی کتاب امام الہند بھی قابل مطالعہ کتاب ہے۔اس میں بھی نیشنلسٹ علماء کے موقف کی وکالت کی گئی ہے۔

**مسئلہ قومیت:**

میر صاحب فرماتے ہیں کہ قومیں اوطان سے نہیں ایمان سے بنتی ہیں، مگر یہ بات کھل کر کیوں نہیں کہتے کہ ازبک، افغانی، تاجک، عرب اور پاکستانی بھی ایک قوم ہیں اور پاکستان پر انہیں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ایسے ہی افغانستان پر، ایران پر، عرب پر، میر صاحب یہ بات نہ کہیں گے، نہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ صرف حضرت مدنی کو مطعون کرنے کے لیے یہ دعوے کرتے ہیں کہ قومیں ایمان سے بنتی ہیں۔ حامد میر ذرا اپنا پاسپورٹ اٹھائیں اور دیکھیں کہ ان کی نیشنیلٹی کیا لکھی ہوئی ہے مسلم یا پاکستانی جناب پاکستان بھی جغرافیہ ہے۔آپ اپنے پاسپورٹ پر اپنی قومیت تبدیل کرائیں۔ہم آپ کا نظریہ درست مان لیں گے۔حامد میر صاحب غور فرمائیں:

ہم پاکستانی ہیں (قومیت)

ہم مسلم ہیں اور ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں (ملت)

ہم ایشیائی ہیں۔

یہ تمام حوالے بیک وقت موجود رہ سکتے ہیں۔ان کا مفہوم دیکھیے:

ہم پاکستانی ہیں (ہمیں اپنے وطن سے محبت ہے اور ہم اس کے دفاع اور ترقی کے لیے کوشاں ہیں)

ہم مسلم ہیں (ہم ملت اسلامیہ کا حصہ ہیں۔ ہماری دعوت عالم انسانی کے لیے ہے اور پوری دنیا رسول پاک کی امت دعوت ہے)۔

یہ وہ باتیں ہیں جن کی تائید پاکستان کا آئین بھی کرتا ہے، سٹیزن ایکٹ بھی۔یہی وہ بات ہے جو مولانا مدنی علیہ الرحمہ نے کہی تھی۔یہی وہ بات ہے جو انہوں نے اپنے مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" میں لکھی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔اب بطور پاکستانی یہ نقطۂ نظر ہماری ضرورت ہے۔ ہمارا آئین ہمارے وطن کے جغرافیے پر نافذ ہو سکتا ہے، عالم اسلام پر نہیں۔قوم ایک سیاسی وحدت ہے اور جغرافیے کی محتاج بھی ہے اور جغرافیے میں محدود بھی۔ملت ایک دینی وحدت ہے اور زمان و مکان سے ماوراء۔ چودہ سو سال پہلے سے قیامت تک کے مسلمان اسی ملت کا حصہ ہیں۔ یہ بہت ہی سادہ اور فطری بات ہے، حامد میر اتنے غبی تو نہیں کہ یہ بات سمجھ نہ سکیں۔ہاں ان کا دل تسلیم نہ کرنا چاہے تو ہم انہیں مجبور کرنے والے کون ہوئے۔اب ذرا حامد میر کے دعوے کے نتائج بھی دیکھ لیتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ قومیں اوطان سے نہیں ایمان سے بنتی ہیں۔اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

Scanned with CamScanner

آپ کا دعویٰ یہ ہوگا۔

ہم مسلم قوم ہیں اور دوسرے غیر مسلم قوم

اس دعوے میں وہ انکسار نہیں جو اس جملے میں ہے کہ ہم پاکستانی ہیں۔

اس دعوے میں وہ دعوت بھی نہیں جو اس جملے میں پوشیدہ ہے کہ :

ہم امت مسلمہ کا حصہ ہیں۔

مسلم قومیت کا نظریہ انکسار کی نفی بھی ہے اور دعوت کی نفی بھی۔ مسلم قومیت کے نظریہ سازوں کی تحریر میں پڑھیے وہ سیدھے سبھاؤ مسلمانوں کو ایک نسلی گروہ قرار دیتے ہیں اور یہی بات دین کی دعوت کی نفی کرتی ہے۔ اِن دنوں مسلم قومیت کا نظریہ اپنا کر ہم اُس انکسار سے دستبردار ہو رہے ہیں جو عالم انسانی میں زندہ رہنے کے لیے کسی بھی قوم کے لیے ضروری ہے۔ حامد میر علمی طور پر ہمارے استدلال کی نفی کرنا چاہیں تو ہم ان کی بات پر غور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں، مگر کھل کر بات کریں۔ کیا وہ پاکستان کے آئین، اقتدارِ اعلیٰ، سٹیزن ایکٹ وغیرہ کی نفی کرنا چاہتے ہیں؟ اس سوال کا کھل کر جواب دیں۔ وہ نیچے دروں اور نیچے بیروں کی کیفیت میں نہ رہیں تو اچھا ہے۔

اسلام تمام انسانوں کو حضور اقدس ﷺ کی امت تسلیم کرتا ہے ایک تو ہے امتِ اجابت، دوسری ہوئی امتِ دعوت، یہ دو قومیں کیسے ہو گئیں۔ امت دعوت کے لوگوں کو ملا جلا کر اپنا مخالف کہنا اور پھر انہی سے مالی امداد کے لیے درخواست پیش کرنا ایک حیران کن عمل ہے جو ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ قوم ایک حادث کیفیت ہے جو زمان و مکان کی پابند ہے، ملت ایک لازمانی اور لامکانی سلسلہ ہے۔ یہ تو قیامت تک کے مسلمانوں اور تمام کرۂ ارض کے مسلمانوں کو ملا دیتا ہے۔ پاکستانی تو پاکستان کے جغرافیے میں محدود ہے۔ اسے لامحدود تصورِ ملت سے الجھا دینا بہرحال دانش مندی نہیں۔ ہمارے دانشور اسلام کو ایک جغرافیے میں محدود کر رہے ہیں اور اسے ایک زبان سے بھی مخصوص کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نہ تو جغرافیہ ہے نہ زبان۔

سارے جغرافیے اس کے، ساری زبانیں اس کی، سارے لوگ اس کے، ساری دنیائیں اس کی:

مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

## دو قومی نظریہ اور دو ملی نظریہ:

ہمارے بہت سے لکھنے والے خصوصاً علماء کرام دو قومی نظریہ پیش کرتے ہیں اور دلائل دو ملی نظریے کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ پرویز صاحب ہوں، مولانا ظفر احمد عثمانی ہوں، مفتی محمد رفیع عثمانی ہوں یا کوئی دوسرا قلمکار دو ملی نظریے کے لیے دلائل پیش کرتا ہے اور دو قومی نظریہ کا اثبات کرتا ہے۔ ان

Scanned with CamScanner

ناموں کی یکجائی سے کوئی صاحب ناراض نہ ہوں۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں خود ہی اس موضوع پر پرویز کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔ اب اگر انھیں پرویز کا قرب عزیز ٹھہرا ہے تو ہم جدا کرنے والے کون ہوئے۔ علامہ اقبال کے ہاں قوم اور ملت کے الفاظ باہم دگر کنفیوز ہو رہے ہیں۔ ان کا ایک شعر سنیے:

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

اس شعر میں ملت اور قوم کے لفظ کو مترادف کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ویسے قوم رسول ہاشمی کہہ کر علامہ نے خود ہی قوم اور ملت کو جدا کر دیا ہے۔ یہ بات بہر حال واضح ہو جانی چاہیے کہ: قومیں اوطان سے بنتی ہیں اور ملتیں ایمان سے بنتی ہیں۔ یہی حرف حق ہے۔ پاکستان کا آئین، سٹیزن ایکٹ سب اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔

حامد میر صاحب نے دوقومی نظریے کی تائید اور حضرت مدنی کی تردید میں لکھے گئے علامہ اقبال کے مضمون کا حوالہ بہت شوق سے دیا ہے۔ یہ مضمون ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو احسان لاہور اور ۱۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو انقلاب لاہور میں شائع ہوا تھا۔ میرے خیال میں یہ مضمون حامد میر نے پڑھا ہی نہیں ہے اور اگر سوئے ظن نہ ہو تو زندہ رود کے مصنف نے بھی یہ مضمون بغور نہیں پڑھا۔ اگر پڑھا ہوتا تو جاوید اقبال یقیناً یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ یہ مضمون علامہ اقبال کا نہیں ہو سکتا۔ خارجی شہادت تو یہی کافی ہے کہ یہ مضمون جب لکھا جا رہا تھا تب علامہ اخبار تک نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کی بینائی کی جو کیفیت تھی، وہ جاوید اقبال خوب جانتے ہیں، حامد میر بھی پڑھ کر جان سکتے ہیں۔ ان سے پھبتی کرنے والے حضرات انہیں معلومات مہیا فرما دیں تو بہتر ہے۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے علامہ نے اس مضمون کے مندرجات سے متعلق کسی ہم نشیں کو آگاہ کر دیا ہو اور ان کے کسی عقیدت مند نے یہ مضمون لکھا ہو۔ یہ بات قرین قیاس تو ہو سکتی ہے۔ مگر قرین صحت نہیں۔ نذیر نیازی نے ''اقبال کے حضور'' میں جو واقعات جمع کیے ہیں، ان کے مطابق علامہ نے اس موضوع پر چودھری محمد حسین مرحوم کو بریف کیا تھا اور یہ مضمون انہوں نے لکھا تھا۔ یہ بات جاوید اقبال بھی تسلیم کرتے ہیں مگر یہ بات درست نہیں۔

علامہ اقبال مارچ ۱۹۳۸ء میں صحت کی جس کیفیت سے گزر رہے تھے، اس کیفیت میں یہ بھی ممکن نہ تھا کہ علامہ کسی موضوع پر چودھری محمد حسین مرحوم کو بریف کرتے۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ چودھری محمد حسین نے یہ مضمون لکھا ہو اور علامہ مرحوم کے نام سے شائع ہوا ہو۔ ایسا ہونا بھی بعید از قیاس ہے کہ چودھری محمد حسین بہر حال متقی آدمی تھے۔ وہ علامہ کے حوالے سے ایسی باتیں نہیں لکھ سکتے تھے جنہیں فکر اقبال سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔ مزید برآں اس مضمون سے خود علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی تردید

Scanned with CamScanner

ہو رہی ہو۔ آخری بات یہ کہ یہ مضمون جس اسلوب بیان میں لکھا گیا ہے، وہ چودھری محمد حسین کا اسلوب ہی نہیں ہے۔ وہ اسلوب جناب غلام احمد پرویز کا ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ اس مضمون میں علامہ کے خیالات کی نہیں، پرویز صاحب کے خیالات کی ترجمانی ہو رہی ہے۔ یہ مضمون علامہ کے نام سے شائع ہوا۔ کسی نے پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی یا کم از کم سمجھنے کی ضرورت گوارا نہیں کی، ورنہ یہ حقیقت کھل سکتی تھی کہ یہ مضمون علامہ کے قلم سے نہیں نکلا، یہ پرویز صاحب کے قلم کا شاہکار ہے۔ سمجھنے کو یہ دلیل ہی کافی ہے کہ علامہ نے تمام عمر کسی علمی موضوع پر اردو میں قلم نہیں اٹھایا۔ وہ علمی موضوع پر جب بھی لکھتے، انگریزی میں لکھتے۔ یہ مضمون دیکھا جائے تو اس میں موجود کوئی دلیل ایسی نہیں جس کی تردید کرنا ضروری ہو۔

## صحافتی نرگسیت:

اِن دنوں مبارک حیدر کی کتاب تہذیبی نرگسیت کا خاصا چرچا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسلمان ان دنوں تہذیبی نرگسیت کا شکار ہیں۔ مجھے ان کے دعوے سے خاصا اختلاف ہے، مگر میرا خیال ہے کہ ان دنوں ایک نفسیاتی مرض صحافتی نرگسیت عام ہو رہا ہے۔ حامد میر صاحب کو اپنی ذات پر بے طرح پیار آرہا ہے اور وہ اپنی تعریف وتحسین میں بری طرح رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی دینی خدمات کو خاصا خراج تحسین، بلکہ خراج عقیدت پیش کیا ہے، ہمیں کیا اعتراض۔ وہ خود کو جو مرضی کہیں، ہمیں تسلیم، مگر ہمیں یہ باور نہیں آتا کہ وہ تاریخ کا علم بھی رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کی تردید کرتی ہیں۔

محترم حامد میر کا خیال ہے کہ وہ معیارِ حق ہیں کہ اِدھر ایک سیکولر اخبار آج کل ان کو برا بھلا کہہ رہا ہے، دوسری طرف علمائے کرام ان کو برا کہہ رہے ہیں۔ حضرت آپ یوں چھوئی موئی نہ بنیں۔ آپ کسی کے بڑوں کو برا کہیں گے تو وہ صفائی تو پیش کریں گے۔ اب یہ کہاں سے لازم ہو گیا کہ آپ تو کسی کو جعلی بیانوں کے تیروں سے چھید دیں۔ دوسرا اُف تک نہ کر سکے۔ حضرت دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ آپ کی صحافتی نرگسیت آپ کو ذات سے باہر دیکھنے نہیں دیتی تو دوسروں کا کیا قصور۔

حامد میر صاحب یقیناً عقل کل نہیں ہیں۔ ہر شخص کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی لائن پر کام کرے، جس لائن کی طرف جناب حامد میر اشارہ فرما دیں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا ان کے انداز میں نہ سوچتا ہو۔ دوسرے کی ترجیحات مختلف ہوں۔ دوسرے کا تجربہ مختلف ہو۔ دوسرے شخص کے لیے حق اختلاف بھی ویسے ہی محفوظ ہونا چاہیے جیسے حامد میر کے لیے حق اختلاف محفوظ ہے دوسروں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ یہ کریں اور یہ نہ کریں صحافتی نرگسیت کا کمال کہا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپ نے کسی جہانگیر تمیمی کے ہاں ایک حوالہ دیکھ لیا اور ایک ایسی کتاب پڑھ لی جسے کتاب کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے آپ نے ایک عظیم شخصیت پر الزام عائد کر دیا تو دوسروں کو یہ

Scanned with CamScanner

اجازت بھی نہیں کہ وہ جہانگیر تمیمی کے حوالے کی حقیقت بیان کرسکیں، اس کو پرکھ سکیں۔ اس کی جعلسازی کو نمایاں کرسکیں۔ دوسروں کو اختلاف کا حق دیجئے۔ تاریخ علوم عقلیہ میں ہے اور ہر عقلی علم میں اختلاف کا حق موجود رہتا ہے۔

## مشترکہ دشمن کون:

حامد میر صاحب نے آخر میں بحث بند کرتے ہوئے یہ دعوت دی ہے کہ آیئے ہم اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف جدوجہد کریں۔ قبلہ بتایئے ہم اور آپ مشترک کب سے ہوگئے اور کیسے ہوگئے۔ آپ جس چینل پر کام کرتے ہیں، وہ روزانہ Voice of America کا پروگرام نشر کرتا ہے۔ اس نشریاتی ادارے اور جیو کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ جیو کو وائس آف امریکا کیا قیمت ادا کرتا ہے۔ آپ کا مفاد تو جیو سے وابستہ ہے اور جیو کا مفاد ایک امریکی ادارے سے۔ اب جناب والا! آپ کا مفاد امریکا سے وابستہ ہے اور ہمارا پاکستان سے۔ ہم پاکستان کو کسی بھی مشکل صورت حال سے بچانا چاہتے ہیں اور آپ ہمارے ملک اور پاکستانی قوم کو کسی نئے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ہم آپ کا مشورہ مانیں یا اپنی دانش پر اعتماد کریں۔ آپ کے چینل کا نام لیتے ہوئے ایک چینل کے اینکر پرسن نے jeo کی واؤ کو معروف پڑھا تھا، آپ بتائیں کہ آپ کے ادارے کا اس پر کیا تبصرہ ہے؟ جناب میر صاحب ہم آپ کو دوستوں کی صف میں نہیں دیکھتے، آپ کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ کیسے بنائیں۔ ضیاء الحق کے دور میں کچھ لوگوں نے آپ کے ساتھ متحدہ محاذ بنایا تھا۔ ہم نے ان کا حشر دیکھ لیا۔ وہ آپ کے مشوروں کی آگ میں جل بجھے ہیں۔ ہمیں خود سے ایسی دشمنی تو نہیں ہے۔ آپ ہماری طرف سے متحدہ محاذ بنانے کی دعوت کے جواب میں غالب کا یہ شعر سن لیں:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

## جہادیوں کا المیہ:

میں ایک مدت سے لال مسجد کے المیے پر خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ میں ان دنوں دکھی ہو رہا تھا جب بعض حلقوں نے مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبدالرشید غازی کو تصادم کا راستہ اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔ تب حامد میر ان بزرگوں کے انٹرویو نشر کر رہے تھے۔ جہادی کارکنوں کا المیہ ۱۹۷۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ امیر المومنین حاجی ضیاء الحق ۱۹۷۷ء میں غیر اخلاقی طور پر برسر اقتدار آئے تھے۔ انہیں نہ عوام کی تائید حاصل تھی، نہ انہیں کوئی قانونی جواز میسر تھا۔ ان دونوں کے متبادل کے طور پر انہوں نے جہادی سرگرمیاں شروع کیں۔ ۱۹۷۹ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کے بعد انہوں نے دینی حلقوں سے

Scanned with CamScanner

رابطہ کیا اور وہاں سے مجاہدین کے گروہ حاصل کیے۔ امریکی سرپرستی اور فوجی تعاون کے نتیجے میں جہادی گروہ تیار ہوئے اور سالہا سال افغان جہاد جاری رہا۔ اُن جہادیوں کی قیادت کرنے والے بہت سے علما سامنے آئے۔ ان لوگوں سے کسی نے یہ نہ پوچھا کہ یہ اسلحہ مہیا کرنے والا کون ہے اور کل کلاں ان سرپرستوں نے دستِ شفقت واپس کھینچ لیا تو تمہارا کیا بنے گا۔ ان لوگوں نے افغان جہاد کے بعد جہاد کو اپنا وظیفۂ حیات ٹھہرایا۔ یہ بیچارے ملا تھے یا نیم ملا، ہم نہیں جانتے۔ حامد میر انہیں مجاہد کہتے ہیں اور مُلا پر فائق خیال کرتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ باشعور مُلا آلۂ کار نہیں بنتا، ''سیاسی شعور سے عاری مُلا'' آسانی سے ان لوگوں کا آلۂ کار بن جاتا اور مجاہد کہلاتا ہے۔ جہاد کے دنوں میں ایک متحدہ محاذ وجود میں آیا۔ اس متحدہ محاذ میں کچھ صحافی بھی تھے۔ افسر بھی تھے، حمید گل بھی تھے، بعض سیاستدان بھی تھے اور امریکا بہادر بھی۔ یہ متحدہ محاذ بس یوں تھا جیسے حلیم پکتا ہے۔ دال میں بھی گوشت کا ذائقہ آ جاتا ہے۔ دال یہ نہیں مانتی کہ اس کا ذائقہ گوشت کی صحبت کا نتیجہ ہے وگرنہ وہ وہی دال ہے جو کہ تھی۔

جمال ہم نشیں بر من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

جہاد کے دنوں میں حامد میر بھی علما کے ہمرکاب ہو گئے اور ان کی ہم نشینی سے لطف لینے لگے۔ انھی دنوں عبدالمجید شاہ ندیم نے انہیں بیٹا ٹھہرایا، مگر یہ نہ بتایا کہ شیخ العرب والعجم حضرت مدنی کون تھے اور کس مقام کے بزرگ تھے۔ جہاد کے جوش و جذبے سے فرصت کہاں تھی۔ یہ جہاد کا فیض تھا کہ وہ لوگ بڑے بڑے مدارس کے مہتمم ہو گئے جو عام حالات میں نہ ہو سکتے۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ہم کون ہوئے جو کسی کی عظمت پر حرف گیری کریں۔

ادھر ۱۱/۹ ہوا، اُدھر حلیم کے اجزا الگ ہونا شروع ہوئے۔ امریکا بہادر کو دال ناپسند ٹھہری۔ یہ لوگ جہاد کے عادی ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کو اور کوئی راہ نہیں سوجھتی تھی۔ ان بیچاروں نے رفقائے قدیم سے پوچھا:

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

''کل ہمارا پیر مسجد سے میخانے آ گیا۔ اب اے یارانِ طریقت ہم کیا تدبیر اختیار کریں۔''

یارانِ طریقت نے تصادم کا راستہ دکھایا۔ یہ جہاد کا راستہ نہ تھا۔ بیچارے مُلا اکٹھے ہوئے اور ان سربکف مجاہدوں سے عرض کیا کہ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو بچاؤ، یہ محفوظ رہے تو سب کچھ محفوظ ہے۔ یارانِ طریقت نے بتایا کہ:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

Scanned with CamScanner

عقل کی بات کرنے والوں پر الزامات کی بارش ہونے لگی۔ کبھی سمجھوتے کا الزام لگا، کبھی رشوت کا، جو جی میں آیا کہا۔ الزام کا ہدف علماء قیادت تھی۔ یہ قیادت تصادم کے راستے سے گریزاں تھی۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مدارس ختم ہوں۔ مساجد اجڑیں اور خانقاہیں بے چراغ ہوں۔ یہ راستہ وفاق المدارس نے بھی اپنایا، جمعیۃ العلماء اسلام نے بھی۔ یہ لوگ یاران طریقت کا ہدف ٹھہرے، جرم جمعیۃ العلماء کا یہی ہے کہ وہ تصادم کا راستہ اپنا کر اپنے طلبہ اور علما کو مروانا نہیں چاہتی۔ یہی وفاق المدارس کا جرم ہے۔ وفاق کے علماء نے ان نیک دل لوگوں کو یہی رائے دی۔ یہی مشورہ دیا۔ ان نیک دل لوگوں نے یارانِ طریقت کے مشورے پر تصادم کا راستہ اپنایا۔ اب یارانِ طریقت نے ان حضرات کو یہ مشورہ دیا کہ وفاق المدارس اور جمعیۃ العلماء کو مدد کے لیے بلاؤ۔ گویا یہ لوگ یہ سب کچھ انہی کے مشورے پر کر رہے تھے۔ یہ لوگ مدد علما سے مانگ رہے تھے، مشورہ یاران طریقت سے۔ اِن میں اعجاز الحق بھی شامل تھے، حامد میر بھی، حمید گل بھی تھے اور وہ لوگ بھی جن کے چہرے مولویوں جیسے اور دل و دماغ کسی اور جیسے تھے۔ یہیں سے غازی برادران کا المیہ شروع ہوا۔ مولانا عبدالعزیز کو غلط مشورہ دے کر رسوا کیا گیا اور مولانا عبدالرشید غازی کو شہادت کی راہ دکھائی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ پیدا ہوا۔ کتنے ہی معصوم لوگ اپنے حسنِ نیت کے ساتھ جنت سدھارے۔ اسلام آباد میں ان شہیدوں نے ایک بہت بڑی بستی آباد کی۔ جو بچیاں قید و بند سے گزریں۔ ان کا المیہ اتنا بڑا ہے کہ مجھ میں یہ المیہ سنانے کا حوصلہ نہیں۔ یہ سارا المیہ حامد میر جیسوں کے مشوروں کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے تو حامد میر مجاہدوں کی توصیف و تحسین کرتے اور علما کو بدنام کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیخ العرب والعجم کا اس ساری بحث سے کیا تعلق؟ ذرا غور کریں کہ حضرت مدنی پر ساری نقد و تعریض کی وجہ یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ کچھ لوگ ان غازی حضرات کی تصادم کی راہ دکھا کر جلد از جلد فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف علماء اس صورتِ حال میں سیاسی رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یہ غیر جذباتی علمی اور دانشمندانہ رویہ اپنے پیر و مرشد اور استاذ الاساتذہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ سے سیکھا ہے۔ حضرت مدنی علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:

''اسلام کے نام پر چلنے والی تحریکیں ضروری نہیں کہ اسلام کے لیے ہوں۔'' یہ وہ بات ہے جو جمعیۃ العلماء کو بھی سمجھ آتی ہے، وفاق المدارس کو بھی اور مولانا حسین احمد کے سبھی اخلاف کو۔ مولانا اسعد مدنی علیہ الرحمہ جب پاکستان آئے تو انہوں نے بھی یہی اصولی بات پیش کی تھی۔ علما کو نام نہاد جہاد کا راستہ دکھانے اور تصادم کی راہ سجھانے والوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ایک غلط خبر نشر کر دی کہ خیر المدارس میں طلبہ نے حضرت مولانا اسعد مدنی پر پتھراؤ کیا:

جو بات کی خدا کی قسم لا جواب کی

پاکستان میں دیو بندی حلقے میں ابھی کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ مولانا احترام الحق تھانوی اوران کے برادران کے جو حضرت مدنی رحمہ اللہ سے گستاخی کا مرتکب ہو سکے۔ حضرت لاہوری رحمہ اللہ فرماتے تھے: لوگ کہتے ہیں بینا سارے اندھا کوئی کوئی۔ میں کہتا ہوں۔ اندھے سارے بینا کوئی کوئی۔ حضرت مدنی اور حضرت رائے پوری بینا ہیں اور پوری دنیا نابینا۔ پوری دنیا ایک بات کہے اور یہ دونوں بزرگ دوسری بات کہہ دیں۔ میں ساری دنیا کی بات رد کر دوں گا۔ ان کی بات مان لوں گا۔

عبد المجید شاہ ندیم ہوں یا کوئی دوسرے عالم، وہ ان باتوں کی نفی نہیں کریں گے۔ ہاں مولانا احترام الحق تھانوی ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ مولانا احتشام الحق تھانوی نمبر میں حضرت مفتی محمد شفیع کو منہ بھر کر گالیاں دے سکتے ہیں تو حضرت مدنی کو بھی ناپسند کر سکتے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی ہوں یا مولانا محمد رفیع عثمانی، میرا خیال ہے ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ وہ کم از کم حضرت مدنی کے تقویٰ سے آگاہ ہیں۔

حامد میر صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ علما کی قوت کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں جہاد کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ وہ ذرا یہ بتائیں کہ جہاد کے فضائل مسلّم، مگر اس کے کچھ مسائل بھی ہیں۔ جہاد کا کچھ مقصد بھی معین ہے۔ آپ ذرا بتائیں کہ آپ نے یا آپ کے دوسرے یارانِ طریقت نے کبھی مقصدِ جہاد پر یا اس کے مسائل پر بھی غور کیا۔ جہاد صرف اور صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہے۔ جہاد سے دین کو عزت ملتی ہے۔ آپ نام جہاد کا لیتے ہیں اور شعائرِ دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا علما کا مذاق اڑانا جہاد ہے یا جہاد کے لیے کسی طرح مفید ہو سکتا ہے۔ کیا قرآن مجید میں مجاہد اور ملا کی تفریق ہے۔ مُلا تو بیچارے اہل الذکر ہیں۔ ان سے دین کا علم سیکھنا چاہیے۔ انہیں مطعون کرنا اور انہیں دین سکھانا کہاں کی دین داری ہے۔ قرآن مجید تو یہ حکم صادر کرتا ہے:

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون۔

اب حامد میر علماء کو دین سکھانے نکلے ہیں۔ یہ لوگ دراصل دینی قوتوں کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے آگ کا ایندھن بنانا چاہتے ہیں۔ جیسے یہ لوگ لال مسجد والوں کو تصادم کی راہ دکھاتے رہے، مگر ان پہ بیتا پڑی تو خبریں ہی سنا سکے۔ اپنے چینل کی رونق بڑھا سکے۔ چودھری شجاعت حسین کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انہوں نے جس کسی سے مذاکرات کیے، موت اس کا مقدر ہوئی۔ یہی حال صحافیوں میں جناب حامد میر کا ہے۔ انہوں نے غازی برادران کا انٹرویو نشر کیا۔ مولانا عبد العزیز کا چہرہ تک نہ دکھایا، مگر انہی کے چینل نے انہیں ٹی وی پر رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حامد میر نے اُسامہ کا انٹرویو نشر کیا۔ ان پر حملہ ہوا۔ میر صاحب نے کلپروں اور اکبر بگٹی کی جنگ کی خبر نشر کی نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ میر تقی میر نے کیا کمال کی بات کہی ہے:

ایسا ہی اُسکے دل کو بھی آباد دیکھیو
جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

میر صاحب حضرت مدنی رحمہ اللہ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں تو وجہ صرف یہی ہے کہ ان کی عطا فرمودہ سیاسی بصیرت حامد میر کے راستے کا پتھر ہو گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

آں آشنا کرد:

راقم کو تعجب تھا کہ مولانا عبدالمجید ندیم حضرت مدنی کو باپ مانتے ہیں اور حامد میر کو بھی بیٹا مانتے ہیں انہیں خوشی اس بات پر ہے کہ حامد میر انہیں مجاہد مانتا ہے۔ وہ حضرت مدنی سے متعلق حامد میر کی تحریریں پڑھ کر بھی رشتوں کی ترتیب برقرار رکھتے ہیں تو یہ ان کا حوصلہ ہے۔ پچھلے دنوں فیصل آباد کے جناب مجاہد الحسینی کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کے کالم شائع ہوئے تو پتا چلا کہ موصوف ان دنوں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے مخالفین کی صف میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے تو ان کا تعارف کچھ اور تھا۔ فیصل آباد صنعتی شہر ہے۔ وہاں سرمایہ دار آباد ہیں۔ اگر جناب مجاہد الحسینی حضرت مدنی رحمہ اللہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں تو شاید جائے تعجب نہیں۔ مولانا عبدالمجید ندیم اِن دنوں اسلام آباد میں مقیم ہیں اور ایک بڑے مدرسے کے مہتمم...... وہ یقیناً مجاہد اسلام ہیں۔ دارالحکومت میں مجاہدین اسلام ہی مدارس بنا سکتے ہیں، ملا تو یہ کام کرنے سے رہے۔ یہ مجاہدین اسلام ضیاء دور میں چن چن کر اسلام آباد میں بسائے گئے۔ ان کے ذریعے جہادی سلسلہ خوب چمکا تھا۔

مولانا عدنان کا کاخیل نے جنرل پرویز مشرف کے سامنے سرِعام سچ بولا تھا۔ اس پر یہ حدیث یاد آئی تھی:

ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے۔

انہوں نے ان دنوں ضربِ مومن میں ایک مضمون لکھا ہے: دوسری مثال...... اس میں قاضی حسین احمد کو حضرت مدنی سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مضمون حق گوئی کی مثال ہے یا ناحق گوئی کی۔ ہم اپنی گزارشات کو آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ لاہور کی ایک تقریب میں ایک صاحب نے یہی حرکت کی تھی تو مولانا سید اسعد مدنی رحمہ اللہ نے کھڑے ہو کر اس بات پر احتجاج کیا تھا۔ کیا اب ضرب مومن کے حلقے میں کوئی شخص مولانا سید اسعد مدنی کے طریقے پر کھڑے ہو کر احتجاج کر سکتا ہے۔ میرے پاس تو صرف ایک سوال ہے: الیس منکم رجل رشید ایک دوست بتا رہے تھے کہ لاہور کی ایک تقریب میں ایک مقرر نے حضرت مدنی کے خلاف دل کا غبار نکالا۔ لاہور کے ایک بڑے عالم بھی تقریب میں موجود تھے۔ ایک چھوٹے سے مولوی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ چھوٹے مولوی اٹھے اور کلمہ حق کہا۔ بڑے مولوی جن کا تعلق لاہور کے سب سے بڑے جامعہ سے ہے، اس بیچارے چھوٹے سے مولوی کو چپ کراتے رہے اور کلمہ حق کی بجائے کلمہ خیر کہتے رہے۔ یہ کلمۂ خیر کلمات شر کی تائید میں تھا۔ اب ان بڑے عالم کے کلمۂ خیر کو کیا کہا جائے گا۔ ہمارے دوست اکثر یہ شعر سنایا کرتے ہیں:

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

Scanned with CamScanner

حرفِ آخر:

آخر میں عرض یہ ہے کہ حضرت مدنی ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ ان کی ملی اور قومی خدمات جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکی ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک وہ آزادی کی جدوجہد کرتے رہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ انہوں نے ہندوستان میں بیٹھ کر مساجد آباد کیں۔ آج بھی وہاں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں تو حضرت مدنی کی کاوشیں اور محنتیں اس میں شامل ہیں۔ مجھے ان کی سیاسی آراء کی وکالت کرنے کی کیا ضرورت، ان کی اپنی تحریریں موجود ہیں اور ان کے مخالفین کی تحریریں بھی۔ ان کی خدمات سے انکار کرنا سورج کی موجودگی میں اس کی نفی کرنا ہے۔ وہ ایک عمر مخالفوں کے طعنے سنتے رہے، مگر وہ اس موقف پر قائم رہے جسے وہ علی وجہ البصیرت حق سمجھتے تھے۔ ان کی کیفیت کو فیض احمد فیض کے لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

اس مضمون کے جملہ حقوق اشاعت حضرت مدنی رحمہ اللہ کے تمام عقیدت مندوں کے لیے محفوظ ہیں۔ (امجد علی شاکر)

Scanned with CamScanner